خاندان
(تاریخ، ضرورت اور اہمیت)

———— سید جلال الدین عمری

افراد سے خاندان وجود میں آتا ہے۔ خاندان ریاست کی پہلی منزل اور اس کی اساس ہے۔ خاندان اور ریاست مل کر معاشرہ کی صورت گری کرتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے سے فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔

خاندان کا آغاز کب ہوا، کیسے ہوا، اس کے کیا عوامل اور محرکات تھے۔ اس کا جواب انسان کی فطرت اور اس کی تاریخ میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔

انسان اجتماعیت پسند ہے

روئے زمین پر جب سے انسان کا وجود ہے وہ اپنے ہم جنس افراد کے ساتھ مل جل کر رہا اور اجتماعی زندگی گزار رہا ہے۔ وہ طبعاً ان سے الگ تھلگ نہیں رہ سکتا۔ اس سے اس کی فطرت انکار کرتی ہے۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ فطری طور پر اجتماعیت پسند ہے۔ تاریخ کے کسی ایسے دور کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی، جس میں اس نے ابنائے نوع سے کٹ کر انفرادی زندگی گزاری ہو۔

انسان اجتماعیت کا محتاج ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ وہ ہر قدم پر دوسرے انسانوں کے تعاون کا محتاج ہے۔ اس کے بغیر وہ غذا، لباس، دوا، علاج اور مکان جیسی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کرسکتا۔ انسان اپنا پیٹ بھرنے کے لیے غذا کا جو لقمہ لیتا ہے اور تن ڈھکنے کے

لیے جو کپڑا استعمال کرتا ہے اس میں بہت سے لوگوں کی کوشش اور محنت شامل ہوتی ہے۔ اسی تعاون سے انسان کی زندگی کی تمام تر رونق قائم ہے۔ اور تہذیب وتمدن کی ساری رنگینیاں اور ہوش ربا جلوے اسی تعاون کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بغیر انسان کی دنیا نہ صرف یہ کہ بے نور ہو جائے گی، بلکہ اس کے وجود اور بقا ہی کو شدید خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

خاندان کا آغاز

انسان جب اس دنیا میں قدم رکھتا ہے تو اس کے ماں باپ سے اس کا اولین رشتہ استوار ہوتا ہے، پھر اس کے بھائی بہن اور دور ونزدیک کے ان تمام افراد سے اس کے تعلقات قائم ہوتے چلے جاتے ہیں جو اس سے خون کا رشتہ رکھتے ہیں۔ ان ہی سے اس کا خاندان تشکیل پاتا ہے اور ان ہی کے درمیان اس کی اجتماعی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

خاندان کی ضرورت واہمیت

انسان اپنے سفرِ حیات میں مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ ایک مرحلہ پیدائش اور بچپن کا ہے، جس میں وہ اپنی بقا اور ضروریات کی تکمیل میں سراسر دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس مرحلہ میں اس کا خاندان اس کی نگہ داشت اور پرورش کرتا ہے، اس کی ضروریات پوری کرتا اور اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ میدانِ عمل میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ استطاعت کے ہوتے ہوئے خاندان اس میں کوتاہی نہیں کرتا۔ کبھی اس میں غفلت بھی ہو جاتی ہے، لیکن قصد وارادہ عموماً شامل نہیں ہوتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس مشکل کام میں بعض اوقات خاندان سے باہر کے افراد کا تعاون بھی حاصل ہوتا ہے۔

انسان کی زندگی کا دوسرا مرحلہ عہدِ شباب کا ہے۔ اس مرحلہ میں وہ خاندان کا ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو اس کی مدد کا ضرورت مند بھی ہوتا ہے اور اس کی مدد کر بھی سکتا ہے۔ اس محلہ میں وہ ان سے جتنا تعاون حاصل کرتا ہے اس سے زیادہ ان کی معاونت کے موقف میں ہوتا ہے۔ چنانچہ عام طور پر خاندان کو اس کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔

تیسرا مرحلہ پیری اور بڑھاپے کا ہے، جو جوانی کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس میں

آدمی ضعف وناتوانی کا شکار ہوجاتا ہے، اس کی قوتیں اور توانائیاں آہستہ آہستہ کم زور پڑنے لگتی ہیں۔کبھی یہ مرحلہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ آدمی بچپن ہی کی طرح لمبی مدت کے لیے خاندان کی توجہ اور خبر گیری کا دوبارہ محتاج ہوجاتا ہے۔

یہ مراحل بالعموم فطری رفتار سے آتے ہیں،لیکن بعض اوقات طبعی نقص،مرض، کسی ناگہانی حادثہ اور اس طرح کے کسی بھی سبب سے آدمی کا خاندان پر انحصار طویل عرصہ اور کبھی زندگی بھر کے لیے ہوجاتا ہے اور خاندان کی یہ ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ وہ اس کی دست گیری اور خدمت کرتا رہے۔

حفاظت اور صیانت کا جذبہ

افراد خاندان کے درمیان ایک دوسرے کی حفاظت اور ضیانت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔قدیم زمانہ میں کسی شخص کی جان، مال اور عزت وناموس پر حملہ ہوتو پورا خاندان اسے اپنے اوپر حملہ تصور کرتا اور ظالم سے انتقام کو اپنا فرض سمجھتا تھا۔ یہ بات بڑی ہی بے غیرتی کی خیال کی جاتی تھی کہ کسی پر حملہ ہو اور اس کا خاندان خاموش تماشائی بنا رہے اور اس کا دفاع نہ کرے۔

خاندان کی حفاظت اور اس کے دفاع کے لیے اس کا طاقت ور اور مضبوط ہونا ضروری تھا۔ جو خاندان مضبوط ہوتا اس کے افراد خود کو زیادہ محفوظ پاتے۔اس سے تعلق رفعتِ شان اور عزت ونام وری کا ذریعہ سمجھا جاتا اور آدمی اس پر فخر کرتا۔کسی کم زور خاندان میں پیدا ہونا آدمی کے لیے ذلت اور پستی کا باعث تھا۔ وہ خود بھی اپنے کو کم زور سمجھتا اور دوسرے بھی اسے کم زور ہی کی حیثیت سے دیکھتے:

خاندان سے تعلق کے اسباب

جب آدمی یہ دیکھے گا کہ خاندان اس کی پرورش کا بار اٹھا رہا ہے،اس کے تعاون سے اس کی ضروریات پوری ہورہی ہیں،مشکلات میں اس کے کام آرہا ہے،اسے جان، مال اور عزت وناموس کا تحفظ فراہم کررہا ہے اور اس کے دشمنوں کے مقابلہ میں سینہ سپر ہے

تو خاندان سے اس کے تعلق میں لازماً اضافہ ہوگا اور اس سے کٹ کر رہنا یا علیحدہ ہونا وہ پسند نہ کرے گا۔

خاندان سے انسان کا جذباتی تعلق بھی ہوتا ہے۔ وہ اس سے دلی قربت اور یگانگت محسوس کرتا ہے اور رنج وراحت میں اسے شریک دیکھنا چاہتا ہے۔ افرادِ خاندان اس کی خوشیوں کو دوبالا کرتے ہیں، ان کی محبت اور ہم دردی اس کے درد والم کو کم کرتی اور اسے سکون فراہم کرتی ہے۔ خاندان اس کی ضرورت بھی ہے اور اس کے لیے وجہ سکون بھی۔

خاندانی زندگی انسان کی خصوصیت ہے

حیوان اور انسان کے درمیان ایک بڑا فرق خاندان کا بھی ہے۔ حیوان کا کوئی خاندان نہیں ہوتا اور انسان کا امتیاز یہ ہے کہ وہ خاندانی زندگی گزارتا ہے۔ حیوان میں نر اور مادہ جنسی تسکین کے لیے ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔ اس سے ان کی نسل بھی پھیلتی رہتی ہے۔ وہ دونوں، خاص طور پر مادہ اپنی نسل کی اس حد تک پرورش اور حفاظت کرتی ہے کہ وہ خود سے زندہ رہ سکے۔ پھر ان کا ایک دوسرے سے تعلق باقی نہیں رہتا اور وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ ان کے درمیان ہم دردی اور محبت کے جذبات بھی ختم ہو جاتے ہیں، اصل و فرع کا احساس جاتا رہتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جاتے ہیں۔ خاندان کے لیے ضروری ہے کہ اصل وفرع کا رشتہ دائمی ہو اور اس کی بنیاد پر تعلقات استوار ہوں۔ حیوان کی فطرت اس سے ناآشنا ہے۔ اس وجہ سے ان کا خاندان ہوتا ہے اور نہ ان کے اندر حقوق اور ذمہ داریوں کا تصور پایا جاتا ہے۔

انسان کا وجود بھی مرد اور عورت کی شکل میں ہے۔ ان کے درمیان جنسی جذبات پائے جاتے ہیں۔ ان کی تسکین سے ان کی نسل کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن انسان اس پہلو سے حیوان سے مختلف ہے کہ اس کا اپنی نسل سے تعلق وقتی اور عارضی نہیں، بلکہ دائمی اور مستقل ہوتا ہے۔ وہ اصل اور فرع میں فرق وامتیاز کرتا ہے، اسے کبھی فراموش نہیں کرتا۔ اسی بنیاد پر اس کے اندر تعاون کا جذبہ اور حقوق اور ذمہ داریوں کا تصور ابھرتا ہے اور خاندان وجود میں آتا ہے۔

خاندان کی شکلیں

خاندان چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہوتے ہیں۔اس کی بہت سی قسمیں ماضی سے چلی آرہی ہیں۔ان سب کو تین بڑے عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے:

ا۔مختصر خاندان: اسے اصطلاح میں نیو کلیر خاندان (Nuclear Family) کہا جاتا ہے۔اس میں آدمی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔کبھی ماں باپ اور بہت ہی قریبی رشتہ دار بھی اس کا حصہ ہوتے ہیں۔ان سب کے کھانے پینے اور رہائش کا نظم مشترک ہوتا ہے۔بعض محققین اسے خاندان کی سب سے قدیم شکل تصور کرتے ہیں۔آج بھی خاندان کی یہ شکل عام ہے۔

۲۔نیوکلیر خاندان سے وسیع خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔اسے توسیعی خاندان (Extended Family) کا نام دیا گیا ہے۔اس میں آدمی اپنی ایک یا ایک سے زیادہ بیویوں اور بچوں کے ساتھ الگ مکان میں رہتا ہے۔اس کے شادی شدہ بچوں میں سے بعض اپنا خاندان الگ بناتے ہیں اور بعض اس کے ساتھ رہائش اختیار کرتے ہیں۔ یہ گو ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہیں،لیکن ان میں سے ہر کمانے والا فرد اپنی مختصر اکائی یا بیوی بچوں کے مصارف خود برداشت کرتا ہے۔اگر کھانے پینے کا انتظام مشترک ہو تو وہ اپنی آمدنی یا خرچ کی مناسبت سے اس میں حصہ لیتا ہے۔

۳۔خاندان کی ایک شکل مشترک خاندان (Joint Family) ہے۔اس میں ایک باپ کی اولاد خاص طور پر نرینہ اولاد اور ان کے بچے سب مل کر رہتے اور خاندان کی معاشی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ان کے کھانے پینے اور رہائش کا نظم بھی ایک ہی جگہ یا ایک ہی مکان میں ہوتا ہے۔خیال کیا جاتا ہے کہ خاندان کا یہ نظام تاریخ کے زرعی دور میں وجود میں آیا،جب کہ معیشت کا انحصار زراعت پر تھا۔زراعت میں جتنے افراد شریک ہوں وہ بہتر طریقہ سے ہوسکتی تھی۔اس میں کاشت کے رقبہ کو بڑھانا اور زرعی زمینوں پر قبضہ کرنا بھی آسان تھا۔بڑے خاندان سے اس کے افراد کو زیادہ تحفظ بھی حاصل ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسانی تمدن کے ابتدائی دور میں خاندان کی یہی شکل تھی،بعد میں

اس کی دوسری شکلیں وجود میں آئیں۔

مشترک خاندان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک بااختیار سربراہ ہوتا ہےاور خاندان کے سارے افراد اس کے احکام اور ہدایات کے پابند ہوتے ہیں۔اس کے برخلاف توسیعی خاندان یا نیوکلیر خاندان میں کسی کو سربراہی کا مقام حاصل نہیں ہوتا، البتہ بزرگ خاندان کے احترام کا جذبہ پایا جاتا ہے۔وہ مشورے دے سکتا ہے۔انھیں اہمیت بھی دی جاتی ہے،لیکن ان کی پابندی ضروری نہیں خیال کی جاتی۔

پدری خاندان اور مادری خاندان

دنیا کے بیش تر ملکوں اور خطوں میں پدری خاندان کا سلسلہ رائج ہے۔اولاد باپ کی سمجھی جاتی ہے۔سارے اختیارات باپ کو حاصل ہوتے ہیں اور وہ باپ کی وارث بھی ہوتی ہے۔ماں کے قانونی حقوق نہیں ہوتے۔اس کے ساتھ حسن سلوک پسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔بعض غیر متمدن علاقوں میں مادری خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔اس میں شادی کے بعد مرد عورت کے گھر رہتا ہے۔عورت گھر کی مالکہ ہوتی ہے۔بچے اس کی طرف منسوب ہوتے ہیں اور جائداد اسی کی سمجھی جاتی ہے۔یہ ایک غیر فطری طریقہ ہے۔متمدن دنیا نے عملاً اسے رد کر دیا ہے۔

مغرب میں آزاد شہوت رانی عام ہو چکی ہے۔اس کے نتیجہ میں مادری سلسلہ کی ایک نئی شکل ابھر رہی ہے۔جنسی تعلقات میاں بیوی کے درمیان محدود نہیں ہیں۔ایک مرد کے متعدد عورتوں سے اور ایک عورت کے کئی ایک مردوں سے تعلقات ہوتے ہیں۔اس میں ماں تو متعین ہوتی ہے،اس لیے کہ وہ بچے کو جنم دیتی ہے،لیکن بچہ کس کے نطفے سے ہے اس کا قطعی علم نہیں ہوسکتا،اس لیے باپ کا تعین دشوار ہے۔چنانچہ اس طرح کا بچہ ماں ہی کے ذریعہ پہچانا جاتا ہے،وہی اس کی ذمہ دار ہوتی ہے،اس میں مرد کی خانگی ذمہ داریاں ختم ہو رہی ہیں اور عورت کی ذمہ داریاں بڑھ رہی ہیں۔یہ دراصل بیسوائی اور قحبہ گری کی ایک شکل ہے جو خاندان کی ہیئت ہی کو بگاڑ رہی ہے اور پورے معاشرے کے لیے تباہ کن ہے۔

خاندان کا زوال

دور حاضر میں خاندان کی اہمیت اور افادیت تسلیم شدہ نہیں رہ گئی ہے۔ خاندان کے پورے نظام ہی پر اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ یہ اعتراضات مختلف نوعیت کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں عورت کے حقوق محفوظ نہیں ہیں۔ ایک خیال یہ ہے کہ خاندان بعض معاشی عوامل کے نتیجہ میں وجود میں آیا۔ اب وہ عوامل ہی نہیں رہے۔ جو لوگ ریاست کے کلیت پسند تصور کے قائل ہیں وہ خاندان سمیت تمام اجتماعی اداروں کو ریاست کے تابع دیکھنا چاہتے ہیں۔ بعض لوگ اسے ماضی کا ایک ایسا ادارہ تصور کرتے ہیں جس کی موجودہ ترقی یافتہ دور میں چنداں ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ وہ کبھی ناگزیر تھا بھی تو اب نہیں رہا۔ خاندان کے فوائد ریاست کے ذریعہ حاصل کیے جاسکتے ہیں یہ مختلف تصورات پورے نظام خاندان پر اثر انداز ہورہے ہیں اور وہ اپنی اہمیت کھوتا جارہا ہے۔ چناں چہ مغرب میں خاندان بری طرح شکست وریخت سے دوچار ہے۔ مرد اور عورت آزاد شہوت رانی کے قائل ہیں۔ وہ نکاح کی بندش اور خاندان کی تعمیر کا بوجھ اٹھانا نہیں چاہتے۔

خاندان کے خلاف دلائل

خاندانی نظام کے خلاف جو دلائل دیے جاتے ہیں یہاں ان کے تجزیہ کی کسی قدر کوشش کی جائے گی:

۱۔ خاندان مرد کے اقتدار کی علامت

خاندان کا ادارہ مرد کی عورت پر بالادستی کی یادگار ہے۔ یہ اس لیے وجود میں آیا کہ عورت کو گھر کی چہار دیواری میں محبوس رکھا جائے تاکہ وہ مرد کی تابع بن کر رہے۔ یہ عورت پر ظلم و زیادتی کی ایک شکل ہے، حالاں کہ آزادیٔ انسان کا فطری حق ہے۔ یہ حق مرد اور عورت دونوں ہی کو ملنا چاہیے۔ مرد اپنی جدوجہد اور تگ و دو میں آزاد رہے اور عورت کو خانہ قید رکھا جائے اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

یہ خیال بالکل غلط ہے کہ خاندان کی اساس مرد کے جبر و ظلم اور عورت کی محکومی پر

ہے۔ خاندان مرد اور عورت دونوں کی فطری ضرورت ہے۔ وہ ان کے لیے سکون کا مرکز ہے۔ اس کے بغیر ان کی زندگی جنگل میں بھٹکے ہوئے مسافر کی زندگی ہوگی۔ خاندان دونوں کا مشترک ادارہ ہے اور وہ مل جل کر اس کی تعمیر کرتے ہیں۔ نہ تو مرد اس کی بربادی چاہتا ہے اور نہ عورت اسے گوارا کرتی ہے۔ اس لیے اس میں کسی کی محکومی اور کسی کی فرماں روائی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

۲- ذرائعِ معاش پر مرد کا قبضہ

عورت خاوند کے ماتحت رہنے پر اس لیے مجبور تھی کہ معاش کے تمام ذرائع و وسائل پر مرد کا قبضہ تھا اور عورت بقائے حیات کے لیے اس کی دست نگر تھی۔ معاشی مجبوری نہ ہوتی تو مرد کی غلامی کا طوق اس کی گردن میں نہ ہوتا۔ آج صورت حال بدل گئی ہے۔ اسے معاشی جدوجہد کی آزادی ہے اور وہ بڑی حد تک معاشی استقلال کی طرف گامزن ہے۔ اس لیے اب وہ مرد کے تابع رہ کر احتیاج کی زندگی گزارنے پر مجبور نہیں ہے۔

یہ بات کہ عورت معاشی حیثیت سے مرد کی دست نگر تھی، اس لیے وہ اپنا پیٹ پالنے اور آذوقۂ حیات حاصل کرنے کے لیے خاندانی زندگی گزار رہی تھی، حقیقت کے خلاف ہے۔ دنیا دیکھتی چلی آرہی ہے اور آج بھی دیکھ رہی ہے کہ ایک شخص مفلوج ہے، بستر پکڑے ہوئے ہے، کسی کی کفالت تو کیا کرے گا دوسروں کے لیے مستقل بوجھ بنا ہوا ہے، ہر وقت خدمت اور تعاون کا محتاج ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی بیوی اس سے محبت کرتی اور اس کی خدمت کو اپنے لیے سعادت تصور کرتی ہے اور کسی قیمت پر اس سے اپنا تعلق ختم کرنا نہیں چاہتی۔ چشمِ عالم نے ایسے واقعات بھی دیکھے ہیں کہ عورت علم و ہنر رکھتی ہے، ذی حیثیت ہے یا اس کے لیے آسائش و راحت کے دوسرے امکانات ہیں، پھر بھی اس نے خاوند کے ساتھ غربت و افلاس کی زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔ دنیا کی دولت و ثروت سے دستِ کش ہو جانا پسند کیا، لیکن حبالۂ عقد کو توڑنا گوارا نہ کیا۔ اس طرح کے ایک دو نہیں بے شمار واقعات کی آخر کیا توجیہ کی جائے گی۔ اگر یہ رشتہ محض معاش کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے تو اسے ان حالات میں ختم ہو جانا چاہیے۔

کہا جاتا ہے کہ سماج نے عزت وذلت کے کچھ خودساختہ معیار قائم کر رکھے ہیں، جن کی رو سے کسی عورت کا خاوند کے چنگل سے آزاد ہونا اس کے لیے ذلت وحقارت کا باعث تصور کیا جاتا ہے۔اس لیے عورت ہر مصیبت برداشت کر کے شوہر کے ساتھ زندگی کے دن کاٹتی رہتی ہے۔اس سماجی جبر کو خوشی اور رضا ورغبت کا نام دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔

یہ بات اس لیے صحیح نہیں ہے کہ یہ انسان کی نفسیات کے خلاف ہے کہ وہ کسی جابرو ظالم کو اپنے دل میں جگہ دے اور اس سے محبت کرے۔آدمی کسی ناپسندیدہ شخص کو برداشت تو کرسکتا ہے،لیکن اس سے محبت والفت کا تعلق قائم نہیں کرسکتا۔میاں بیوی کے درمیان محبت کا جو رشتہ پایا جاتا ہے اسے سماج کا دباؤ ہر گز نہیں کہا جاسکتا۔

یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ مرد اور عورت کے درمیان ازدواجی تعلق کی بنیاد وہ محبت ہے جو فطری طور پر ان کے درمیان پائی جاتی ہے۔ خاندانی نظام اسی جذبۂ الفت ومحبت کو دوام عطا کرتا ہے۔وہ ان کی فطری کشش کو عارضی یکجائی کا نہیں بلکہ مستقل رفاقت کا ذریعہ بناتا ہے۔وہ ان کے سامنے کچھ ایسے اغراض ومقاصد رکھتا ہے، جس کی تکمیل کے لیے انھیں پوری زندگی لگانی پڑتی ہے اور معاش کی ہزار اہمیت کے باوجود وہ اس سے بلند ہو کر سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

۳-خاندانی تعلقات کی بنیاد معاش ہے

انسان کی نسل حیوان کی نسل سے بہت مختلف ہے۔حیوان کی نسل بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاتی اور فطرت کی ہدایت ورہنمائی میں زندگی گزارنے لگتی ہے،لیکن انسان کی نسل طویل عرصہ تک لطف ومحبت اور توجہ اور عنایت کا مطالبہ کرتی ہے۔اس میں تھوڑی سے غفلت اور کوتاہی بھی اس کے وجود اور اس کے مستقبل کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔خاندان کے نظام میں یہ طویل اور تھکادینے والا عمل والدین بخوشی انجام دیتے ہیں۔وہ اس کی حفاظت،نشوونما اور تعلیم وتربیت میں اپنی توانائیاں صرف کردیتے ہیں۔اس میں خاندان کے دوسرے افراد کا تعاون بھی حاصل ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے بھی معاشی محرکات کارفرما ہیں۔ والدین اولاد کی

پرورش اس لیے کرتے ہیں کہ بڑھاپے میں ان کا سہارا ثابت ہوں، جب ان کے قویٰ کم زور ہوجائیں اور وہ تگ ودو کے قابل نہ رہ جائیں تو ان کی اولاد ان کا معاشی بار اٹھائے۔ انھوں نے جس طرح اس کی خدمت کی ہے وہ ان کی خدمت کرے۔ یہ معاشی ضمانت کی ایک شکل تھی اور عملاً یہی ہوتا بھی تھا۔ ماں باپ اولاد کی نگہ داشت اور خدمت کرتے اور اولاد ان کی ضروریات پوری کرتی۔

یہ پورا فلسفہ کہ انسان محض معاشی محرک کے تحت اولاد کی پرورش کرتا اور اس سے محبت کا اظہار کرتا ہے، اس کی فطرت سے متصادم ہے۔ اس میں اس کے پاکیزہ جذبات و احساسات کی توہین ہے۔ تاریخ کے طویل تجربات اس کے خلاف ہیں۔ اسے اگر درست مان لیا جائے تو انسان حیوان سے بدتر قرار پائے گا۔ حیوان بھی مستقبل کی معاشی فکر سے آزاد ہوکر اپنی نسل کی حفاظت اور پرورش کرتا ہے۔ فطرت نے اسے اس کام کے لیے جو صلاحیت اور توانائی عطا کی ہے وہ پوری پوری صرف کرتا ہے۔ فضائے آسمانی میں اڑنے والا پرندہ یہ سوچ کر اپنی نسل کے لیے ایک ایک تنکا جمع کرکے گھونسلا نہیں بناتا اور ایک ایک دانہ چن کر اسے اس خیال سے نہیں کھلاتا کہ وہ آئندہ اس کی اسی طرح خدمت کرے گا۔ یہی حال تمام حیوانات کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ فطری راہ نمائی کے تحت ہے، تو انسان کی اپنی نسل کے لیے کوشش ہی کو کیوں ایک معاشی تدبیر قرار دیا جائے؟ اس کی کیا معقول دلیل ہے؟

اس پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ اگر اولاد سے محبت اور ان کی خدمت کے پسِ پشت معاشی فکر کارفرما ہوتی ہے اور اسی کے لیے آدمی تگ ودو کرتا ہے تو متمول والدین کو اولاد کی تمنا ہی نہیں ہونی چاہیے۔ اگر اولاد ہو تو اس کی پرورش کی فکر اور اس کی ترقی کی تمنا سے ان کا سینہ خالی ہونا چاہیے۔ کیا دولت مند ماں باپ اسی طرح سوچتے اور اس پر عمل کرتے ہیں؟ اس سے آگے آپ ایک ایسے بچے کا تصور کیجیے جو بالکل معذور اور اپاہج ہے، جس سے کسی نفع کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی، جو زندگی بھر والدین کے لیے بارِ گراں ہی بنا رہے گا۔ سوال یہ ہے کہ ایک ماں اس مضغۂ گوشت کو اپنے سینے سے کیوں

لگائے رکھتی ہے؟ کون سا جذبہ ہے جو باپ کو اس کی خبر گیری پر مجبور کرتا ہے؟ کیا کوئی شخص بہ سلامتی ہوش وحواس کہہ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ اس توقع پر ہے کہ وہ مستقبل میں ان کے لیے معاشی سہارا ثابت ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر حیوان کے اندر اس بات کا شدید داعیہ پایا جاتا ہے کہ وہ دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنا وارث اور جانشیں پیدا کرے، تاکہ اس کی نسل جاری رہے۔ یہ داعیہ حیوان کے مقابلہ میں انسان کے اندر شدید تر ہے۔ اگر یہ داعیہ سلب ہو جائے تو سطحِ زمین سے حیوان کا وجود بھی ختم ہو جائے گا اور نوع انسانی بھی باقی نہ رہے گی۔

۴۔ ریاست انسانی ضروریات پوری کرے گی

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ بچے کی پرورش اور تعلیم وتربیت کے لیے اب خاندان کی وہ اہمیت نہیں رہی جو قدیم زمانہ میں تھی۔ اب یہ کام ریاست بہتر طریقہ سے کر سکتی ہے۔ بسا اوقات اولاد سے متعلق ذمہ داریوں کا ادا کرنا والدین کے لیے دشوار، بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ ایک غریب اور نادار خاندان جو خود نان شبینہ کا محتاج ہے وہ اپنے بچے کی پرورش اور اس کی تعلیم وتربیت کا کیا انتظام کر سکتا ہے؟ معاشی طور پر کم زور ماں باپ ہی نہیں خوش حال والدین بھی بعض اوقات ان ذمہ داریوں کو ادا نہیں کر پاتے۔ اس طرح کتنے ہی ہونہار ذہین اور قابل بچے، جو ملک وملت کے کام آسکتے ہیں، ضائع ہو جاتے ہیں۔ ریاست اپنے وسیع ذرائع ووسائل کی بنا پر اس ذمہ داری کو بہتر طریقہ سے انجام دے سکتی ہے۔

اس مسئلہ پر کئی پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ریاست انسان کو بعض سہولتیں تو فراہم کر سکتی ہے، لیکن خاندان کا بدل نہیں بن سکتی۔ دنیا کے کسی ادارہ کے پاس لطف ومحبت کی وہ دولت نہیں ہے جسے ماں باپ شب وروز اپنی اولاد پر نچھاور کرتے رہتے ہیں۔ ماں اپنی محبت بھری نگاہوں سے انسانیت، شرافت اور ہم دردی کا جو پاکیزہ درس اولاد کو دیتی ہے وہ کسی تربیت گاہ یا دانش کدہ سے اسے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس کی لوریاں بچے کے لیے خواب آور نہیں ہوتیں، بلکہ عداوت، نفرت اور کینہ وکدورت دور کرنے کا بھی باعث ہوتی ہیں۔ باپ کا دستِ شفقت اس کے دل ودماغ سے ناپاک جذبات کو جس

خوبی سے نکال سکتا ہے وہ خوبی کسی دوسرے ہاتھ میں مشکل ہی سے آسکتی ہے۔

آج اخلاقی قدریں بری طرح پامال ہو رہی ہیں۔ مہر و محبت اور بے غرض خدمت کا جذبہ مفقود ہوتا جارہا ہے۔ انسان سفاکی اور درندگی میں جنگل کے خوں خوار درندوں کو پیچھے چھوڑ چکا ہے اور اس کی ستم رانیوں نے دنیا کو جہنم زار کر رکھا ہے۔ ان حالات میں محبت اور ہم دردی کے جذبہ کو ابھارنے اور فروغ دینے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے۔ کیا سرکاری تربیت گاہیں بچے کے اندر یہ خوبیاں پیدا کرسکتی ہیں۔ ایک دایہ بچے کو وقت پر دودھ پیش کرسکتی ہے، لیکن وہ پاکیزہ جذبات اس کے حلق کے نیچے اتار نہیں سکتی جن کا مخزن صرف ماں کا سینہ ہوتا ہے۔

جہاں تک بچے کی پرورش، صحت اور تندرستی، تعلیم اور معاشی تحفظ کا سوال ہے یہ ایک فلاحی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات پوری کرے۔ تاکہ کوئی شخص بھوکا اور ننگا نہ رہے، دوا علاج سے محروم نہ ہو اور اس کی رہائش کا انتظام ہو۔ ان ہی بنیادی ضروریات میں تعلیم بھی داخل ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ کسی کو ناخواندہ اور جاہل نہ رہنے دے، تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچائے اور علمی ترقی کے مواقع فراہم کرے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس کے لیے خاندان کو ختم کرنا یا بچے کو خاندان سے جدا کرنا ضروری ہے؟

بعض اوقات موجودہ دور کی مشینی زندگی کو اولاد کی تربیت کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ خیال قطعاً غلط ہے کہ آج کا انسان اس قدر مصروف ہے کہ وہ اولاد کی مناسب نشو ونما اور تعلیم و تربیت کی طرف توجہ نہیں کرسکتا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے ساتھ اتنے غیر ضروری لوازمات وابستہ ہو گئے ہیں کہ اس کی توجہ حقیقی فرائض اور ذمہ داریوں سے ہٹ گئی ہے۔ اور وہ روز بروز مسلسل غفلت کی نذر ہوتی چلی جارہی ہیں۔ دورِ حاضر کے مادی تصورات نے انسان کو عیش و عشرت کا فریفتہ کر رکھا ہے۔ وہ اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہا ہے اور جہاں تک ہو سکے سماجی اور معاشرتی بندشوں سے آزاد زندگی گزارنا چاہتا ہے۔ اس راہ میں ذمہ داریاں چوں کہ رکاوٹ بنتی ہیں، اس لیے اس کے اندر ذمہ داریوں سے گریز کا رجحان پرورش پا رہا ہے۔ وہ خاندان کی ذمہ داریوں سے بھی

ممکنہ حد تک بچتا ہے، اس کے لیے وہ بچوں کو نرسری کے حوالہ کرکے اپنا وقت سیر سپاٹوں، تفریح گاہوں اور کلب گھروں میں گزارنا پسند کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ خاندانی زندگی گزارنے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے مقابلہ میں آزادانہ شہوت رانی کی راہ اختیار کرنے لگا ہے۔ ورنہ آج کے ماحول میں بھی آدمی خاندانی ذمہ داریاں ادا کرنا چاہے تو کوئی ایسی رکاوٹ نہیں ہے جس پر قابو نہ پایا جاسکے۔

۵۔ دورِ جدید میں خاندان منتشر ہو چکا ہے

خاندان کے تصور میں آدمی کی بیوی اور بچوں کے علاوہ اس کے ماں باپ، بھائی بہن اور دور و نزدیک کے اعزہ واقارب بھی شامل ہیں اور ان کے حقوق اور ذمہ داریاں تسلیم کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان رشتوں اور تعلقات کی قدر و قیمت اس دور میں تھی جب کہ خاندان کے افراد ایک ساتھ رہتے بستے تھے اور مشترک خاندانی نظام قائم تھا، جس میں ایک فرد کا حسن سلوک دوسرا فرد دیکھتا اور اس سے نفسیاتی طور پر متاثر اور اس کے زیر احسان ہوتا۔ پھر وہ ان احسانات کا بدلہ ادا کرنے کی کوشش کرتا۔ یہیں سے رشتے ناطے وجود میں آئے، ان کی اہمیت تسلیم کی گئی اور ان کے حقوق وفرائض کے ضابطے تیار ہوئے، لیکن موجودہ مشینی دور نے اس کیفیت ہی کو ختم کر دیا ہے۔ آج ایک بچے کا ماں باپ اور اہل خاندان سے وہ تعلق نہیں ہے جو زمانہ قدیم میں تھا۔ بسا اوقات اسے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے ماں باپ کون ہیں اور کس فرد سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ اگر وہ ماں باپ کو جانتا بھی ہو تو اس ماں کا کیا احترام کرے گا جس کی محبت اسے صحیح معنی میں نہ ملی ہو۔ جس بچے کو پیدائش کے بعد نرسری سے لے کر اعلیٰ تعلیم اور ملازمت یا کاروبار تک کبھی اس کی ماں نے اسے سینہ سے نہیں لگایا، اس کی نگاہ میں اس کی کیا عظمت ہوگی اور اس کے حق کا تصور اس کے ذہن میں کیسے آئے گا؟ اس باپ کو وہ کیوں چاہے گا اور اس کی اطاعت وفرماں برداری کرے گا جس نے اس کی پرورش ہی نہ کی ہو، بلکہ اس کی پرورش ریاست نے کی ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ خاندانی نظام اپنے کچھ مقاصد رکھتا ہے۔ اگر ان مقاصد کی اہمیت ہے اور معاشرہ کی بہتر تعمیر وترقی کے لیے ان کا پورا ہونا ضروری ہے تو خاندان کو نہ

صرف یہ کہ باقی رہنا چاہیے، بلکہ اسے مضبوط سے مضبوط تر ہونا چاہیے۔کوئی ایسا طرزِ حیات، جس سے خاندان کی بنیادیں متزلزل ہوں اور وہ ختم ہوتا چلا جائے، سخت نقصان دہ ہوگا۔ خاندان کو انسان نے اس لیے نہیں چھوڑا کہ وہ اپنے مقاصد میں نا کام ہے، بلکہ بعض دیگر اسباب کی بنا پر اس نے خاندان سے بغاوت کی اور اس کے تار و پود بکھیر دیے اور خاندان کے ٹوٹنے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہو گیا اسے پر کرنے کے لیے وہ دوسرے اداروں کا سہارا لے رہا ہے، اس میں وہ نا کام ہے۔

ریاست خاندان کا بدل نہیں ہے

موجودہ دور کے انسان کے نزدیک خاندان کا کم زور یا ختم ہونا کوئی بڑا نقصان نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ریاست اس کا بہتر بدل بن سکتی ہے، حالاں کہ ریاست کے اندر اس کے وسیع اختیارات کے باوجود خاندان کا متبادل بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

خاندان ایک مختصر سا ادارہ ہے۔ اس کی اپنی ضروریات اور تقاضے ہیں۔ وہ اپنی تربیت و تنظیم کے کچھ اصول رکھتا ہے۔ ان ضروریات کو وہی لوگ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں جو اس سے براہ راست متعلق ہوں اور وہی اس کے جذبات اور نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے اس کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ ریاست کا دائرہ بہت وسیع ہے اور وہ زیادہ تر قانون اور طاقت کے بل پر اپنا نظم چلاتی ہے۔ ریاست خاندان کے ساتھ تعاون کر سکتی ہے، لیکن وہ جذبات اپنے اندر نہیں پیدا کر سکتی جو افراد خاندان کے درمیان پائے جاتے ہیں۔

یہاں ایک اور پہلو بھی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ یہ کہ حکومت کا دائرہ جس قدر محدود ہوگا افراد کی صلاحیتیں اسی قدر نکھر کر سامنے آئیں گی۔ آدمی اپنے بل پر تجربات کے مختلف مراحل سے گزرنے کے بعد ہی عظیم ذمہ داریوں کو اٹھانے کا اہل ہوتا ہے۔ اگر خاندان حکومت کے اثر سے آزاد ہو اور اسے صحیح طریقہ سے کام کے مواقع حاصل ہوں تو وہ ایک تربیت گاہ کا بھی کام دے سکتا ہے، جس میں افراد محدود پیمانے پر مختلف ذمہ داریاں سنبھالنے اور انھیں بحسن و خوبی انجام دینے کی تربیت پاتے ہیں۔ یہ تربیت صحیح ہو تو اجتماعی زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی کار آمد ہو سکتی ہے۔

☆